اقامت دین ہندوستان میں: معنویت اور تقاضے!

ڈاکٹر محمد رفعت 13/07/2017

mazameen.com

ہندوستان کے احوال میں اقامت دین کی معنویت کی تفہیم سے قبل، اقامت دین سے متعلق اصولی مباحث کی یاددہانی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ اس اصطلاح کا ماخذ یہ آیات ہیں :

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِن شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبِّي عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ۔ فَاطِرُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ جَعَلَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا وَمِنَ الْأَنْعَامِ أَزْوَاجًا يَذْرَؤُكُمْ فِيهِ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ۔ لَهُ مَقَالِيدُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ۔ شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ اللَّهُ يَجْتَبِي إِلَيْهِ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَن يُنِيبُ (الشوریٰ: 10-13)

"تمہارے درمیان جس معاملے میں بھی اختلاف ہو، اُس کا فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے۔ وہی اللہ میرا رب ہے، اُسی پر میں نے بھروسہ کیا اور اُسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔ آسمانوں اور زمین کا بنانے والا، جس نے تمہاری اپنی جنس سے تمہارے لیے جوڑے پیدا کیے، اور اسی طرح جانوروں میں بھی (انہی کے ہم جنس) جوڑے بنائے، اور اِس طریقے سے وہ تمہاری نسلیں پھیلاتا ہے۔ کائنات کی کوئی چیز اُس کے مشابہ نہیں، وہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے۔ آسمانوں اور زمین کے خزانوں کی کنجیاں اُسی کے پاس ہیں۔ جسے چاہتا ہے کھلا رزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تُلا دیتا ہے، اُسے ہر چیز کا علم ہے۔ اُس نے تمہارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا، اور جسے (اے محمد ﷺ) اب تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعے بھیجا ہے، اور جس کی ہدایت ہم ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دے چکے ہیں، اِس تاکید کے ساتھ کہ "قائم کرو اِس دین کو اور اِس میں متفرق نہ ہو جاؤ"۔ یہی بات اِن مشرکین کو سخت ناگوار ہوئی ہے جس کی طرف تم انہیں دعوت دے رہے ہو۔ اللہ جسے چاہتا ہے اپنا کر لیتا ہے، اور وہ اپنی طرف آنے کا راستہ اُسی کو دکھاتا ہے، جو اُس کی طرف رجوع کرے۔"

اِن آیات میں بہت سے اہم حقائق پر روشنی ڈالی گئی ہے:

الف)دین قائم کرنے کی ہدایت صرف محمد ﷺ کو نہیں دی گئی بلکہ آپ سے پہلے کے انبیاء علیہم السلام کو بھی دی گئی تھی۔اُن میں نمایاں ترین انبیاء)
۔ حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام ہیں

ب)انسانوں کے درمیان جس معاملے میں بھی اختلاف ہو اُس کا فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے۔چناں چہ اُس کا نازل کردہ دین جن ہدایات پر مشتمل ہے اُن کا)
تعلق حیاتِ انسانی کے محض کسی ایک پہلو سے نہیں ہے بلکہ زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔اس لیے کہ انسانوں کے درمیان اختلافات زندگی کے کسی
ایک پہلو تک محدود نہیں ہیں، بلکہ ہر معاملے میں ہوتے رہے ہیں اور آج بھی موجود ہیں۔

ج)دین کو قائم کرنے کی ہدایت مشرکین کو ناگوار گزرتی ہے۔یہ ناگواری اس بنا پر ہے کہ مشرکین اللہ کی ہدایت کے بجائے اپنے آباءواجداد کی غلط)
۔ روایات کی پیروی کرنا چاہتے ہیں

۔ د)دین کو قائم کرنے کی اس ہدایت کو قبول کرنے کی توفیق انہی انسانوں کو ملتی ہے جو صدقِ دل سے طالبِ ہدایت ہوں اور اللہ کی طرف رجوع کریں)

اقامتِ دین کا مفہوم

قرآنِ مجید کا یہ ارشاد کہ ''تمہارے درمیان جس معاملے میں بھی اختلاف ہو،اُس کا فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے۔'' اس امر میں کوئی شبہ نہیں چھوڑتا کہ دین کا
تعلق پوری زندگی سے ہے۔چناں چہ دین کو قائم کرنے کے بدیہی معنی یہ ہیں کہ پوری زندگی کو اور اس کی تمام سرگرمیوں کو ہدایتِ الٰہی کے مطابق منظم
: کیا جائے۔دستورِ جماعت اسلامی ہند میں 'اقامتِ دین' کی اصطلاح کی یہی تشریح بیان کی گئی ہے۔دستورِ جماعت کے الفاظ یہ ہیں

اقامتِ دین میں لفظ دین سے مراد وہ دینِ حق ہے جسے اللہ رب العالمین اپنے تمام انبیاء کے ذریعے مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں میں بھیجتا رہا ہے اور جسے آخری اور مکمل صورت میں تمام انسانوں کے لیے اپنے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کے ذریعے نازل فرمایا، اور جو اَب دنیا میں ایک ہی مستند، محفوظ اور عند اللہ مقبول دین ہے اور جس کا نام 'اسلام' ہے۔

یہ دین انسان کے ظاہر و باطن اور اُس کی زندگی کے تمام انفرادی و اجتماعی گوشوں کو محیط ہے۔ عقائد، عبادات اور اخلاق سے لے کر معیشت، معاشرت اور سیاست تک انسانی زندگی کا کوئی ایک شعبہ بھی ایسا نہیں ہے، جو اس دائرے سے خارج ہو۔ یہ دین جس طرح رضائے الٰہی اور فلاحِ آخرت کا ضامن ہے اسی طرح دنیوی مسائل کے موزوں حل کے لیے بہترین نظامِ زندگی بھی ہے، اور انفرادی و اجتماعی زندگی کی صالح اور ترقی پذیر تعمیر صرف اسی کے قیام سے ممکن ہے۔ اس دین کی اقامت کا مطلب یہ ہے کہ کسی تفریق و تقسیم کے بغیر اس پورے دین کی مخلصانہ پیروی کی جائے اور ہر طرف سے یکسو ہو کر کی جائے۔ اور انسانی زندگی کے انفرادی و اجتماعی تمام گوشوں میں اسے اس طرح جاری و نافذ کیا جائے کہ فرد کا اِرتقا، معاشرے کی تعمیر اور ریاست کی تشکیل سب کچھ اسی دین کے مطابق ہو۔ (دستورِ جماعت اسلامی ہند، دفعہ :4)

مندرجہ بالا جامع تشریح، کارِ اقامتِ دین کے متنوّع تقاضوں کو واضح کرتی ہے۔ ان تقاضوں میں نمایاں ترین تقاضے فرد کے ارتقاء، معاشرے کی تعمیر اور ریاست کی تشکیل سے متعلق ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ کی ہدایت پر انسانی زندگی کے ہر گوشے میں اُسی وقت مکمل طور پر عمل کیا جاسکتا ہے جب ایک ایسی ریاست وجود میں آجائے جو احکامِ الٰہی کی مخلصانہ پیروی اور اُن کے نفاذ کا ارادہ رکھتی ہو۔ چناں چہ اسلامی ریاست کا قیام اقامتِ دین کے نصب العین کا لازمی جز ہے۔

اسلامی ریاست کے قیام سے قبل

ہندوستان میں اسلامی ریاست موجود نہیں ہے۔ 'اسلامی ریاست موجود نہ ہو تو مسلمان کیا کریں۔' اس سلسلے میں سورہ الشوریٰ میں رہنمائی ملتی ہے۔ سورہ شوریٰ مکّی سورت ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں کہ اس کا زمانہ نزول سورہ حٰم سجدہ سے متصل معلوم ہوتا ہے اور سورہ حٰم سجدہ کے نزول کا زمانہ حضرت حمزہ کے ایمان لانے کے بعد اور حضرت عمر کے ایمان لانے سے پہلے ہے۔ سورہ شوریٰ میں مکّہ کے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی تصویر پیش کی گئی

ہے جو یہ بتاتی ہے کہ اسلامی ریاست کی غیر موجودگی میں بھی مسلمانوں کو منظم اجتماعی زندگی گزارنی چاہیے اور اُن کے نظم وضبط کا معیار ایسا ہونا چاہیے جو

:ایک ریاست کا ہوا کرتا ہے

فَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَمَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَمَا عِنْدَ اللّٰہِ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰی رَبِّہِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ۔ وَالَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا ھُمْ یَغْفِرُوْنَ ۚ وَالَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّہِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ۔ وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَھُمُ الْبَغْیُ ھُمْ یَنْتَصِرُوْنَ۔ وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُہٗ عَلَی اللّٰہِ اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ۔ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِہٖ فَاُولٰٓئِکَ مَا عَلَیْھِمْ مِّنْ سَبِیْلٍ۔ اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَی الَّذِیْنَ یَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَیَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۚ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِکَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ۔ (الشوریٰ 34-36)

”جو کچھ تم کو ملا ہے وہ دنیا کی (چند روزہ) زندگی کا سامان ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہتر ہے اور باقی رہنے والا ہے۔ (آخرت کا یہ انجام) اُن لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لاتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں اور جب غصہ آئے تو معاف کر دیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رَب کی پکار پر لبیک کہا جو نماز قائم کرتے ہیں اور اپنے کام آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں اور جو کچھ ہم نے اُن کو دیا ہے اُس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اِن لوگوں کی صفت یہ ہے کہ جب اِن پر زیادتی کی جائے تو اُس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ برائی کا بدلہ ایسی ہی برائی ہے البتہ جو معاف کر دے اور اصلاح کرے اُس کا اجر اللہ کے ذِمہ ہے۔ بے شک وہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ جو کوئی ظلم کیے جانے کے بعد بدلہ لے تو اُس پر کچھ الزام نہیں۔ الزام تو اُن لوگوں پر ہے جو انسانوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق سرکشی کرتے ہیں۔ اُن کے لیے دردناک عذاب ہے، البتہ جس نے صبر کیا اور معاف کر دیا تو یہ بلاشبہ اولالعزمی کے کاموں میں سے ہے۔“

:مندرجہ بالا آیات میں چند اہم امور بیان ہوئے ہیں

الف) مسلمان معاشرے کا اللہ سے تعلق)

ب) مطلوبہ اخلاقی صفات)

ج)شورائیت)

د)دفاع)

اِن امور کے سیاق میں ایک ایسے مسلمان معاشرے کی شبیہ ہمارے سامنے آتی ہے جو منظم ہے اور اپنی مستقل اجتماعی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اپنی فکر اور تصورات کے لحاظ سے بھی آس پاس کے جاہلی معاشرے سے جدا ہے اور اپنی اجتماعی ہیئت و خصوصیات کے اعتبار سے بھی ممتاز ہے۔ ایسا منظم معاشرہ اپنے اندر یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ جب حالات ساز گار ہوں تو بالکل فطری انداز میں وہ ایک ریاست کی شکل اختیار کر لے۔ اس کے مقابلے میں شعور اور اجتماعیت سے محروم کوئی سماج محض ایک بھیڑ کی مانند ہوتا ہے اور خواہ اُسے کتنے ہی ساز گار حالات میسر آئیں، وہ اقتدار اور فرماں روائی کے مقام پر نہیں پہنچ سکتا۔ مکّی زندگی کی یہ تصویر آج دنیا کے اُن تمام خطوں کے مسلمانوں کو دعوتِ غور و فکر دیتی ہے جہاں وہ غیر اسلامی ریاستوں کے تحت زندگی گزار رہے ہیں ۔

تعلق باالله

مسلمان معاشرے کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اُس کے افراد اللہ سے زندہ اور گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ اِس تعلق کی بنیاد ایمان ہے اور ایمان کا پہلا مظہر اللہ کی پکار پر لبیک کہنا ہے۔ اہلِ ایمان کی اِس خوبی کا ذکر سورہ آلِ عمران میں کیا گیا ہے :

رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّکُمْ فَاٰمَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَکَفِّرْ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۚ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِکَ وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ۔(آل عمران : 193،191)

اہلِ خرد کہتے ہیں)اے ہمارے رب! ہم نے ایک پکارنے والے کی پکار سنی جو کہتا تھا کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ تو ہم ایمان لے آئے۔اے ہمارے رب!)"
ہمارے گناہ بخش دے، ہماری برائیاں ہم سے دور کردے اور ہمارا انجام نیک لوگوں کے ساتھ کر۔اے ہمارے رب! ہم کو وہ کچھ عطا کر جس کا وعدہ تو نے
"اپنے رسولوں سے کیا ہے اور ہم کو قیامت کے دن رُسوا نہ کر۔بے شک تو اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔

:ایمان کا ایک اور مظہر اللہ پر بھروسہ کرنا ہے۔اسی توکل کی ہدایت بنی اسرائیل کو گئی تھی

(2: وَآتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَجَعَلْنَاهُ هُدًى لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ أَلَّا تَتَّخِذُوا مِن دُونِي وَكِيلًا۔(بنی اسرائیل

"اور ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی اور اُسے بنی اسرائیل کے لیے ذریعہ ہدایت بنایا،اِس تلقین کے ساتھ کہ میرے سوا کسی کو وکیل اور کارساز نہ بنانا۔"

توکل کے معنی یہ ہیں کہ تدابیر اختیار کرتے وقت ناجائز امور سے بچا جائے اور صرف جائز تدابیر اختیار کی جائیں،اور یہ کہ بھروسہ خدا پر کیا جائے نہ کہ اپنی تدابیر پر۔

:ایمان کا ایک مظہر یہ ہے کہ آدمی اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرے۔سورۂ بقرہ میں ہے

وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَتَثْبِيتًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ أَصَابَهَا وَابِلٌ فَآتَتْ أُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ فَإِن لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ(البقرۃ: 265)

وہ لوگ جو اپنے مال اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے خرچ کرتے ہیں اپنے دلوں کو ثابت رکھ کر،اُن کی مثال ایسی ہے جیسے ایک باغ بلند زمین پر ہو اور"
اُس پر زور کی بارش ہو،چنانچہ وہ دوگنا پھل لائے اور اگر(زور کی بارش نہ ہو بلکہ) محض پھوار ہی ہو تو وہ بھی اُس باغ(کی شادابی) کے لیے کافی ہے۔اللہ
"تمہارے کاموں کو خوب دیکھتا ہے۔

لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلٰٓئِکَةِ وَالْکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ وَآتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَآتَی الزَّکٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ۔ (البقرة: 771)

”نیکی یہ نہیں ہے کہ تم اپنا رخ مشرق کی طرف کرلو یا مغرب کی طرف بلکہ (فی الحقیقت) نیکی یہ ہے کہ ایک شخص اللہ اور یومِ آخر پر، ملائکہ، کتابوں اور نبیوں پر ایمان لائے اور اللہ کی محبت میں مال کو خرچ کرے رشتہ داروں، یتیموں، محتاجوں، مسافروں اور مانگنے والوں پر اور گردنوں کو چھڑانے کے لیے۔ اور نیک وہ لوگ ہیں جو نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور جب عہد کریں تو اُسے پورا کریں۔ تنگی اور مرض میں اور حق و باطل کی جنگ کے موقع پر صبر کریں ۔ یہی لوگ سچے ہیں اور یہی متقی ہیں“۔

ایمان کا سب سے نمایاں مظہر اقامتِ صلوٰۃ ہے۔ جو سوسائٹی اقامتِ صلوٰۃ کا اہتمام نہ کرے وہ اسلامی سوسائٹی نہیں کہلا سکتی اور جس سماج کے اندر محض کچھ افراد نماز کا اہتمام کرتے ہوں اور باقی اُس سے غافل ہوں وہ یقیناً باشعور اسلامی سماج نہیں ہے۔ چناں چہ بنی اسرائیل کے زوال کو عروج سے بدلنے کے لیے اور اُن کے اندر دینی زندگی پیدا کرنے کے لیے اُن کو اقامتِ صلوٰۃ کی ہدایت کی گئی تھی:

وَقَالَ مُوْسٰی یٰقَوْمِ اِنْ کُنْتُمْ آمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَیْهِ تَوَکَّلُوْا اِنْ کُنْتُمْ مُّسْلِمِیْنَ ؛ فَقَالُوْا عَلَی اللّٰهِ تَوَکَّلْنَا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ۔ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِکَ مِنَ الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ۔ وَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰی وَاَخِیْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِکُمَا بِمِصْرَ بُیُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُیُوْتَکُمْ قِبْلَةً وَّاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ (یونس: 84-87)

”اور موسیٰ نے (بنی اسرائیل کو) ہدایت کی کہ اے میری قوم کے لوگو! اگر تم واقعی اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اُسی پر بھروسہ کرو اگر تم اُس کے فرماں بردار ہو۔ تب انھوں نے کہا کہ ”ہم نے اللہ پر بھروسہ کیا۔ اے ہمارے رب! ہم کو ظالموں کے گروہ کے لیے فتنہ نہ بنا اور اپنی رحمت سے ہمیں کافر قوم کے غلبے سے نجات دے۔“ پھر ہم نے موسیٰ اور اُس کے بھائی کی طرف وحی بھیجی کہ اپنی قوم کے لیے مصر میں کچھ گھر مقرر کرلو اور اپنے گھروں کو قبلہ رو بناؤ اور نماز قائم کرو اور اہلِ ایمان کو خوش خبری دے دو“۔

:اسی اقامتِ صلوۃ کی ہدایت نبی ﷺ کو کی گئی

(العنکبوت :54) اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْہٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ۔

"تمہارے رب کی جانب سے جو کتاب تمہاری طرف وحی کی گئی ہے اُس کو پڑھو اور نماز قائم کرو۔ بے شک نماز بے حیائی کے کاموں سے اور منکر سے روکتی ہے اور اللہ کی یاد سب سے بڑی چیز ہے۔ اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔"

مسلمان معاشرے کی تربیت

اللہ سے زندہ، شعوری اور گہرے تعلق کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان معاشرے میں بلند اخلاقی صفات پروان چڑھیں۔ اہلِ ایمان کے کردار کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ بڑے گناہوں سے بچتے ہیں۔ بڑے گناہوں سے پرہیز کا تذکرہ سورہ فرقان میں کیا گیا ہے:

وَالَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ وَلَا یَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا یَزْنُوْنَ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ یَلْقَ اَثَامًا۔ یُّضٰعَفْ لَہُ الْعَذَابُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَیَخْلُدْ فِیْہٖ مُہَانًا۔ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِہِمْ حَسَنٰتٍ وَکَانَ اللّٰہُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا۔ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّہٗ یَتُوْبُ اِلَی اللّٰہِ مَتَابًا۔ وَالَّذِیْنَ لَا یَشْہَدُوْنَ الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا کِرَامًا۔ (الفرقان: 67 -62)

"اور (رحمان کے بندوں کی صفت یہ ہے کہ) وہ اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے اور کسی ایسی جان کو ناحق قتل نہیں کرتے جسے اللہ نے حرام کیا ہے اور نہ زِنا کے مرتکب ہوتے ہیں۔ جو کوئی یہ کام کرے وہ بڑے گناہ میں پڑ گیا۔ قیامت کے روز اُس کو دوگنا عذاب دیا جائے گا اور وہ پڑا رہے گا اُس میں خوار ہو کر۔ البتہ جو توبہ کرلے ایمان لائے اور نیک عمل کرے تو ایسے لوگوں کے برے کاموں کو اللہ نیکیوں سے بدل دے گا۔ بے شک اللہ معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔ جو کوئی توبہ کرے اور نیک کام کرے تو وہ اللہ کی طرف پھر آتا ہے پورے طور پر۔ اور رحمان کے بندے وہ ہیں جو جھوٹ کے گواہ نہیں بنتے اور جب اُن کا گزر لغو کاموں پر ہوتا ہے تو شریف انسانوں کی طرح گزر جاتے ہیں۔"

:سورہ اعراف میں نمایاں اخلاقی خرابیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور ان کو حرام ٹھرایا گیا ہے

قُلۡ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الۡفَوَاحِشَ مَا ظَہَرَ مِنۡہَا وَ مَا بَطَنَ وَ الۡاِثۡمَ وَ الۡبَغۡیَ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ وَ اَنۡ تُشۡرِکُوۡا بِاللّٰہِ مَا لَمۡ یُنَزِّلۡ بِہٖ سُلۡطٰنًا وَّ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا عَلَی اللّٰہِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿ (الاعراف : 33)

لوگوں کو) بتادو کہ اللہ نے جو چیزیں حرام کی ہیں وہ یہ ہیں: بے حیائی کے کام خواہ کھلے ہوں یا چھپے، گناہ اور ناحق زیادتی اور یہ کہ تم اللہ کے ساتھ کسی)"
"ایسے معبود کو شریک کرو جس کے لیے اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی ہے اور تم اللہ کی طرف منسوب کر کے ایسی بات کہو جس کا تمہیں علم نہیں ہے۔

اہلِ ایمان کی نمایاں صفت یہ ہے کہ غصہ آئے تو وہ اُس کو پی جاتے ہیں اور انسانوں کو معاف کر دیتے ہیں۔ اُن کا معاشرہ ایسا نہیں ہوتا جہاں افراد اور گروہ بہ ہر صورت ایک دوسرے سے انتقام لینے پر تُلے ہوں، بلکہ وہاں عفو و درگزر کا عام رواج ہوتا ہے۔ اس معاشرے کے لوگ اپنے جذبات پر کنٹرول کرتے ہیں اور بے قابو نہیں ہوتے۔ اُن کے اقدامات سنجیدہ غور و فکر کے بعد ہوتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ اُن کے سینوں میں دھڑکتے ہوئے دل نہ ہوں یا دلوں میں جذبات نہ ہوں، لیکن وہ جذبات کو عقل کے تابع رکھتے ہیں اور عقل کو شریعتِ الٰہی کے تابع رکھتے ہیں۔ اُن کے غیظ و غضب کا اظہار اگر ہوتا ہے تو رضائے الٰہی کے لیے ہوتا ہے۔ چناں چہ یہ اظہار حدودِ الٰہی کا تابع ہوتا ہے، حدود نا آشنا نہیں ہوتا۔

شورائیت کا اہتمام

مسلمان معاشرے کے سیاق میں شورائیت کی صفت کا ذکر یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ مسلمان معاشرہ ایک منظم معاشرہ ہے جس میں نظامِ سمع و طاعت موجود ہونا چاہیے۔ اس معاشرے میں اجتماعی امور کو طے کرنے کے لیے جو طریقِ کار بتایا گیا، وہ شورائیت کا طریقِ کار ہے۔ شورائیت کی اسپرٹ اور اُس کے عملی نظام کا قیام مسلمان معاشرے کو اسلامی ریاست کی خصوصیات سے عملاً آشنا کراتا ہے اور افرادِ معاشرہ کی تربیت کرتا ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں :

"مشورے سے کام کرنا اللہ کو پسند ہے (خواہ) دین کا (کام) ہو یا دنیا کا۔ نبی کریم ﷺ مہماتِ امور میں برابر صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرماتے تھے۔ اور صحابہ آپس میں مشورہ کرتے تھے۔ حروب وغیرہ کے متعلق بھی اور بعض مسائل واحکام کی نسبت بھی۔ بلکہ خلافتِ راشدہ کی بنیاد ہی شوریٰ پر قائم تھی۔"

شورائیت کی اسپرٹ کا تقاضا یہ ہے کہ معاشرے کے تمام افراد کی مشورے کے عمل میں بلاواسطہ یا بالواسطہ شرکت ہو۔ جنگ اُحد میں جن اصحاب سے کچھ کوتاہیاں ہو گئی تھیں، اُن کی لغزش کے باوجود نبی ﷺ کو اللہ نے ہدایت دی کہ اُن سے بہ دستور مشورہ لیتے رہیے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ۔ (آلِ عمران: 951)

"یہ محض اللہ کی رحمت ہے کہ تم اُن (اہلِ ایمان) کے لیے نرم دل واقع ہوئے ہو۔ اگر کہیں تم تند خو اور سخت دل ہوتے تو یہ سب تمہارے پاس سے چھٹ جاتے۔ پس ان کو معاف کر دو، ان کے لیے اللہ سے مغفرت طلب کرو اور ان سے امور میں مشورہ لو۔ پھر جب تم (کسی رائے پر) عزم کر لو تو اللہ پر بھروسہ کرو۔ بے شک اللہ توکل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔"

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اِس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"(اللہ نے نبی ﷺ سے فرمایا کہ) حق تعالیٰ نے آپ کو نرم دل اور نرم خو بنایا۔ آپ اصلاح کے ساتھ اُن کی کوتاہیوں سے اغماض کرتے رہتے ہیں۔ سو یہ کوتاہی بھی (جو جنگ احد میں بعض اصحاب سے ہوئی) معاف کر دیجیے اور گو خدا اپنا حق معاف کر چکا ہے۔ تاہم ان (مسلمانوں) کی مزید دل جوئی اور تطییبِ خاطر کے لیے ہم سے بھی اُن کے لیے معافی طلب کریں، تاکہ یہ شکستہ دل آپ کی خوشنودی اور انبساط محسوس کر کے بالکل مطمئن و منشرح ہو جائیں۔ اور یہ صرف معاف کر دینا ہی کافی نہیں (بلکہ) آئندہ بہ دستور ان سے معاملات میں مشورہ لیا کریں۔"

شورائیت کے اصول کو عملی جامہ پہنانے کے لیے امتِ مسلمہ کی تاریخ میں جو طریقے اپنائے گئے ہیں، آج کے دور کے مسلمان اُن سے استفادہ کر سکتے ہیں اور دنیا کے دوسرے معاشروں کے تجربات سے بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ بہ ہر صورت مطلوب یہ ہے کہ اسلامی ریاست کی غیر موجودگی میں بھی مسلمان معاشرہ منظم اجتماعی زندگی گزارے اور اس اجتماعی زندگی کی تنظیم شورائیت کے اصول پر قائم کی جائے۔

مسلمانوں کا دفاع

اہلِ ایمان کے منظم معاشرے کی ایک اہم صفت یہ ہے کہ جب اہلِ ایمان پر زیادتی کی جاتی ہے تو وہ اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ زیادتی کے لیے اصل لفظ جو استعمال ہوا ہے وہ 'بغی' ہے۔ یہ اُن مذموم صفات میں سے ہے جن سے اللہ نے انسانوں کو روکا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَایِٔ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ۔ (النحل: 90)

"بے شک اللہ عدل، احسان اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی سے، منکر سے اور سرکشی (بغی) سے منع کرتا ہے۔ وہ تم کو سمجھاتا ہے تا کہ تم یاد رکھو۔"

'بغی' کا مفہوم بیان کرتے ہوئے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں:

"(بغی کے معنی ہیں) سرکشی کر کے حد سے نکل جانا، ظلم و تعدّی پر کمربستہ ہو کر درندوں کی طرح کھانے پھاڑنے کو دوڑنا اور دوسروں کے جان و مال یا آبرو وغیرہ لینے کے واسطے ناحق دست درازی کرنا۔"

سیاقِ کلام سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سورہ شوریٰ میں 'بغی' سے مراد وہ زیادتی ہے جو مسلمان معاشرے کے خلاف، بہ حیثیتِ مجموعی، کی جائے۔ اگر پورے مسلمان معاشرے کو زیادتی کا نشانہ بنایا جارہا ہو تو مسلمانوں کی یہ ذمہ داری بیان کی گئی ہے کہ وہ اُس زیادتی کا مقابلہ کریں۔ اُس کے بعد اگلی آیت

میں افراد کے لیے اس بات کو پسند کیا گیا ہے کہ وہ اپنے اوپر (انفرادی حیثیت میں) ہونے والی زیادتیوں کو معاف کر دیں، بشرطے کہ در گزر کے اِس رویّے کے نتیجے میں اِصلاح کی توقع ہو۔ یہ عفو و در گزر کا رویہ اُن کو اجرِ الٰہی کا مستحق بنائے گا۔ بہ ہر صورت افراد کے لیے بھی عفو و در گزر کو لازم نہیں ٹھہرایا گیا ہے۔ اُن کو اجازت دی گئی ہے کہ زیادتی ہونے کی صورت میں، وہ چاہیں تو انتقام لے سکتے ہیں، لیکن انتقام لینے میں وہ حدِّ استحقاق سے تجاوز نہیں کر سکتے۔

اپنے اوپر ہونے والی زیادتوں کا مقابلہ کرنا اور اپنا دِفاع کرنا ایک فرد کا حق ہے اور دنیا کے ہر نظامِ قانون میں اِس حق کو تسلیم کیا گیا ہے۔ قرآنِ مجید بتاتا ہے کہ اہلِ ایمان معاشرے کو بھی اپنے دفاع کا حق حاصل ہے، بلکہ اُس کی یہ ذمہ داری ہے کہ اُن زیادتیوں کا مقابلہ کرے جو پورے معاشرے پر کی جا رہی ہوں۔ اگر کوئی معاشرہ ایسی زیادتیوں کا مقابلہ نہیں کرتا تو اُسے بے حس کہا جائے گا۔ وہ کوئی باشعور اور زندہ معاشرہ نہیں ہو سکتا۔ البتہ زیادتیوں کا مقابلہ کرنے اور اپنا دفاع کرنے میں مسلمان معاشرہ شرعی حدود کا پابند ہو گا اور قانون شکنی سے مجتنب رہے گا۔

ہندوستان میں اقامت دین

ہندوستان میں فریضۂ اقامت دین کی ادائیگی کے لیے ضروری ہے کہ یہاں کے ہندو سماج کی صورتِ حال کا تجزیہ کیا جائے۔ آزادیِ ہند کے بعد یہاں کے ہندو سماج کو دو بنیادی چیلنج در پیش تھے:

الف) نئے حالات میں ذات پات کے نظام کو برقرار رکھنا——اور)

ب) ہندو سماج کے جذباتی اتحاد کے لیے مذہب کی بجائے کوئی متبادل بنیاد فراہم کرنا۔)

(Cosmetic) ملک کی تحریکِ آزادی کی قائد 'کانگریسی فکر' نے پہلے چیلنج کا جواب اس طرح دیا کہ ذات پات کے نظام میں بعض سطحی اور ضمنی اصلاحات کرلیں۔ دوسرے چیلنج کے جواب میں انہوں نے نیشنلزم کو اتحاد کی نئی بنیاد کے طور پر اختیار کیا۔ دوسری جانب ملک میں ہندتو کی طاقتور تحریک بھی موجود تھی۔

ہندتو' کے حاملین نے بھی ان دونوں چیلنجوں کا جواب دیا۔ پہلے چیلنج کے سلسلے میں ان کا رویہ کانگریسی فکر کے حاملین کے رویہ سے ہم آہنگ تھا۔ فرق' صرف اتنا تھا کہ کانگریسی چھوت چھات کے خاتمہ پر زور دیتے تھے اور 'ہریجن' کی نئی اصلاح استعمال کرتے تھے، جب کہ ہندتو کے علم برداروں نے عام طور پر ذات پات کے مسئلے پر خاموشی اختیار کی۔ رہا ذات پات کے نظام کے مکمل خاتمے کا معاملہ تو اس کے قائل نہ کانگریسی تھے نہ ہندتو کے علم بردار، البتہ ضمنی اصلاحات کے روادار دونوں تھے۔

دوسرے چیلنج کے جواب میں ہندتو کے علم برداروں کا یہ خیال تھا اور ہے کہ کانگریس کا مبہم 'نیشنلزم' ایک بے جان تصور ہے اور ہندو سماج کے اندر نیا حوصلہ، امنگ اور ولولہ پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ مزید برآں اس میں یہ خرابی بھی ہے کہ تہذیبی اقلیتوں کی انفرادیت باقی رہتی ہے اور وہ کسی وقت بھی مضبوط ہو کر ہندو سماج کے لیے خطرہ بن سکتی ہے۔

چناں چہ ہندتو کے حاملین محض نیشنلزم کے سادہ فلسفے کو کافی نہیں سمجھتے، بلکہ 'کلچرل نیشنلزم' کا تصور پیش کرتے ہیں۔ کلچرل نیشنلزم کا تقاضا یہ ہے کہ ملک کے ایک ایک فرد کے اندر اس ملک کی روایتی تہذیب و تاریخ، بزرگوں اور رسوم و رواج سے گہری جذباتی وابستگی پیدا کی جائے۔ یہ باشندے محض ایک سیاسی وحدت نہ بنیں، بلکہ ان کے جذبات بھی اس ملک کے روایتی ڈھانچے میں ڈھل جائیں۔ 'کلچرل نیشنلزم' کے اس پروگرام کو بروئے کار لانے کے لیے وہ یہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ مختلف گروہوں کی تہذیبی انفرادیت ختم ہو جائے۔ ان کے نزدیک باشندگان ملک میں جذباتی تہذیبی ہم آہنگی اور یک رنگی کے بغیر نہ ولولہ اور امنگ پیدا ہو سکتی ہے نہ ملک ترقی کر سکتا ہے اور نہ اندرونی و بیرونی دشمنوں کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔

ہندتو کے علم بردار یہ بھی سمجھتے ہیں کہ کلچرل نیشنلزم کے اس منصوبے کو مسلمان آسانی سے قبول نہیں کریں گے۔ چناں چہ وہ مسلمانوں کو اپنی راہ کا سب سے بڑا روڑا خیال کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں انہیں مسلمانوں سے یہ اندیشہ بھی لاحق ہے کہ ایک مستقل مسلم سماج کی موجودگی (جو ہندو سماج سے ممتاز اور ممیز ہے اور اپنا نمایاں تہذیبی وجود رکھتا ہے) ذات پات کے نظام کے لیے مستقل چیلنج بنی رہے گی اور اسے دیکھ دیکھ کر ہندو سماج کے محروم طبقات کو برابر یہ یاد آتا رہے گا کہ وہ کس عدم مساوات اور نابرابری کے نظام میں بندھے ہوئے ہیں۔ چناں چہ خود ہندو سماج کی بقا اور ذات پات کے نظام کے تسلسل کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ ایک مستقل مسلم سماج باقی نہ رہے۔ 'کلچرل نیشنلزم' کا منصوبہ یہی ہے۔

ان دو نمایاں طرز ہائے فکر کے علاوہ ملک میں ایک تیسری تحریک بھی موجود ہے۔ وہ 'امبیڈکر وادی فکر' کی نمائندگی کرتی ہے۔

امبیڈکر وادی طرز فکر

امبیڈکر وادی تمام مظلوم طبقات کو متحد کر کے (جن میں ہندو سماج کے پس ماندہ، اچھوت طبقات اور اقلیتیں شامل ہیں) جمہوری طریقۂ انتخاب کے ذریعے اقتدار حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ان کو اقتدار مل جائے تو وہ کس نظریے اور Ideology کو نافذ کریں گے؟ اس سوال کا کوئی واضح جواب امبیڈکر وادیوں کے پاس نہیں ہے۔ البتہ اس فکر کے نمائندوں کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ملک کے دستور اور رائج سیکولر ڈیموکریٹک نظام کو اُسی طرح قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ کوئی متبادل نظریہ یا نظام وہ تجویز نہیں کرتے، البتہ وہ چاہتے ہیں کہ اب تک جو طبقات محروم رہے ہیں، اب اقتدار ان کے ہاتھ میں آئے۔ تقریباً تمام امبیڈکر وادی انتقامی جذبات رکھتے ہیں اور وقتاً فوقتاً ان عزائم کا اظہار کرتے ہیں کہ موقع ملنے پر وہ ظالم طبقات سے انتقام لیں گے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ذات پات کا نظام محض اس واقعے کا نام نہیں ہے کہ اقتدار پر 'اعلیٰ ذات' والوں کا قبضہ ہے، بلکہ یہ نظام اپنی گہری نفسیاتی جڑیں رکھتا ہے۔ ہندو سماج کے ظالم اور مظلوم دونوں طبقات کے عقائد ایک ہی ہیں اور ان عقائد کی بنیاد پر بننے والی نفسیات بھی یکساں ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک طبقہ ظلم کرتا ہے اور دوسرا اس ظلم کو گوارا کرتا ہے۔ امبیڈکر وادی اس حقیقت کو نہیں سمجھتے اور اس بنا پر وہ مظلوم طبقات کے اندر نفسیاتی اور فکری تبدیلی پیدا کیے بغیر ملک کے اندر سیاسی تبدیلی کو ممکن اور کافی سمجھتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے اس چیلنج کو سمجھا ہی نہیں ہے، جو مغربی تہذیب کی آمد کی وجہ سے ذات پات کے نظام کو درپیش ہے۔ نہ انہوں نے خود ذات پات کے نظام کی گہری جڑوں کو سمجھا ہے۔ اس لیے امبیڈکر وادی فکر بہت کم زور اور مبہم ہے۔ اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ انتقامی جذبات اور 'عملِ پیہم' نے امبیڈکر وادیوں کو ایک قابل لحاظ سیاسی قوت بنا دیا ہے۔

کانگریسی فکر کے حاملین کی طرح امبید کر وادی بھی نیشنلزم کے قائل ہیں اور اس سلسلے میں کانگریسی فکر میں جو ابہام ہے، وہ امبید کر وادیوں کی فکر میں بھی پایا جاتا ہے۔

کانگریسی فکر کے حاملین اس امر کا دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ملک کے سارے طبقات، علاقوں اور مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے نمائندے ہیں، چناں چہ وہ سب کی حمایت کے مستحق ہیں۔ اس کے بر خلاف اکثر امبید کر وادی صاف کہتے ہیں کہ وہ صرف مظلوم طبقات کو منظم کرنا چاہتے ہیں اور ان کی متحدہ جمہوری طاقت سے کام لے کر اقتدار حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ کانگریسیوں اور امبید کر وادیوں کا یہ اختلاف سب سے اہم اختلاف ہے۔

رجحانات کی کش مکش

آزادی کے بعد طویل عرصے تک ملک کے نظام پر اس رجحان کا غلبہ رہا ہے، جسے اوپر کی سطروں میں 'کانگریسی فکر' کہا گیا ہے۔ اب یہ رجحان کم زور ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے دو اسباب ہیں :

الف) اب کانگریس کی قیادت جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے، ان میں وہ خصوصیات باقی نہیں رہیں جو تحریکِ آزادی کے دوران پیدا ہوئی تھیں۔ ہر تحریک، جو قربانی چاہتی ہو، اپنے علم برداروں کے اندر بعض اعلیٰ انسانی صفات پیدا کرتی ہے۔ تحریکِ آزادی نے بھی یہ کام انجام دیا تھا، لیکن اب طویل عرصہ گزر جانے کے بعد وہ اعلیٰ انسانی صفات مفقود ہوتی جا رہی ہیں۔

ب) تحریکِ آزادی کے دوران ملک کی آزادی کا نصب العین ایک کشش رکھتا تھا۔ اس کشش نے باصلاحیت افراد کو کانگریس کے گرد جمع کیا۔ اب آزادی کے بعد ایسا کوئی نعرہ موجود نہیں ہے جو افراد کو کانگریس کی طرف کھینچ سکے۔

آزادی کے بعد وقتاً فوقتاً کانگریس کے رہ نماؤں نے ایسے نعرے دیے جو جذباتی اپیل رکھتے تھے۔ مثلاً پنڈت نہرو نے 'ملک کی تعمیر نو' کا نعرہ دیا، اندرا کی بات کہی۔ یہ سب نعرے وقتی اپیل رکھتے تھے اور (Stability) گاندھی نے 'غریبی ہٹاؤ' کا پرچم بلند کیا اور راجیو گاندھی نے ملک کے 'استحکام ایک مدت تک کانگریس ان سے عوام کو متأثر کرتی رہی۔ اب بہ ظاہر اس کے پاس ایسا کوئی نیا نعرہ نہیں ہے جو عوام کو متوجہ کر سکے اور ان کے اندر ولولہ اور جذبہ پیدا کر سکے۔

دوسری جانب امبید کر وادی رجحان قوت حاصل کر رہا ہے، لیکن اس کی بنیادی کم زوری، جس کا اوپر ذکر کیا چکا ہے، یہ ہے کہ اس کے پاس موجودہ نظام کا کوئی متبادل نہیں ہے۔ اس کے علاوہ وہ ذات پات کے نظام کا صحیح عرفان بھی نہیں رکھتا۔ یہ کم زوریاں اس کی بڑھتی ہوئی سیاسی قوت کو کسی مرحلے میں گھٹا بھی سکتی ہیں ۔

امبید کر وادی اور ہندتو کے علم بردار دونوں ٹکراؤ کے قائل ہیں۔ ان کے مقابلے میں کانگریسی فکر کی بنیادی خصوصیت سمجھوتہ (Accomodation) ہے، خواہ وہ تہذیبی اقلیتوں کو Accomodate کرنا ہو یا خود ہندو سماج میں مختلف طبقات کو accomodate کرنا ہو۔ مستقبل کا سب سے واضح امکان یہ ہے کہ کانگریسی رجحان کی طاقت کم زور ہونے اور ہندتو وامبید کر واد کی طاقت بڑھنے کے نتیجے میں ملک میں تصادم کی فضا بڑھتی جائے گی۔ دوسرا امکان یہ ہے کہ علاقائی و دیگر پارٹیاں کانگریس کے متبادل کے طور پر ابھر آئیں گی اور اس طرح کچھ عرصہ اور تصادم کو ٹالا جا سکے گا۔ اس طرح ممکن ہے کہ ملک پر کانگریسی فکر کا ہی غلبہ، ایک دوسرے روپ میں باقی رہے۔

دین کی اقامت کے تقاضے

رجحانات کی کش مکش کے اس ماحول میں امت مسلمہ کو دین کی اقامت کا فریضہ انجام دینا ہے۔ اس کے لیے مسلم مزاج کی تربیت ضروری ہے۔ مسلمان اس وقت ہندتو کے بڑھتے ہوئے اثرات کو دیکھ کر تشویش میں مبتلا ہیں۔ یہ تشویش بجا ہے۔ ہندتو کے مقابلے میں کمیونسٹ اور امبید کر وادی حلقوں کے بارے میں مسلمان خوش گمان ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کے تشخص کی حفاظت اور ان کے مسائل کے حل کے لیے ان سیاسی طاقتوں سے اچھی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ چناں چہ مسلمانوں کے درمیان بحث اور گفتگو اس موضوع پر ہوتی ہے کہ ان رجحانات میں کس کا ساتھ دیا جائے؟ مسلمان عوام اور ان کی سیاسی قیادت نے اب تک اس انداز سے سوچنا شروع نہیں کیا ہے کہ ان مختلف قوتوں پر انحصار (Dependence) اور ان سے سودا چکانے

کے بجائے کوئی اور راستہ بھی ہو سکتا ہے، جو مسلمانوں کے شایانِ شان ہو اور جس پر چل کر وہ نہ صرف اپنے تشخص کی حفاظت (Bargaining) کر سکیں، نیز اپنے مسائل حل کر سکیں، بلکہ اپنے فرضِ منصبی کو بھی انجام دے سکیں۔

مسلمانوں کا عام مزاج یہ ہے کہ وہ کسی نہ کسی طاقت پر انحصار کرنا چاہتے ہیں اور پھر اس طاقت سے سودے بازی کر کے، دباؤ ڈال کر یا فریاد کر کے اپنے مسائل کے حل کی توقع رکھتے ہیں۔ اس مزاج کو 'انحصار' (Dependence) یا 'غلامانہ مزاج' سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں جو مزاج ایک مسلمان کے شایانِ شان ہے، اس کو خود اعتمادی یا (Self Reliance) سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ امت کے مسائل کے حل کی جانب پہلا قدم یہ ہے کہ مزاج کی تبدیلی عمل میں آئے۔ مسلمان عوام اور خواص میں غلامانہ ذہنیت کے بجائے خود اعتمادی پیدا ہو۔ مزاج کی اس تبدیلی کے بغیر کوئی مسلسل اور طویل مدتی کام نہیں کیا جا سکتا۔ وقتی جوش و جذبہ کچھ وقتی کام کرا سکتا ہے اور لوگ کچھ قربانیاں بھی دے سکتے ہیں، لیکن مزاج کی اس تبدیلی کے بغیر مستقل (Sustained) کام نہیں کر سکتے۔ جو تحریک مسلمانوں کو اقامت دین کے لیے متحرک کرنا چاہتی ہو، اس کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کے مزاج میں انقلاب لائے۔

خود اعتمادی کا حصول

الف) پہلا تقاضہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو 'فکر' میں خود کفیل ہونا چاہیے۔ یعنی ان کی 'فکر' خصوصاً سیاسی فکر مکمل اسلامی ہو، اسلامی اور مغربی فکر کا ملغوبہ) نہ ہو۔ وہ جن اصطلاحات میں سوچیں، تبصرہ کریں، جائزہ لیں، پالیسی بنائیں اور منصوبہ بندی کریں، وہ خالص اسلامی اصطلاحات ہوں۔ محض شریعت کے حدود کا لحاظ کافی نہیں ہے، بلکہ سوچ اور فکر کا منبع اسلام ہونا چاہیے اور فکر کا طریقہ 'اسلامی اصطلاحات اور تصورات کے حالات پر انطباق' سے عبارت ہونا چاہیے۔

اس بات کو ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس سوال پر غور کیجیے: ''ہندوستان میں رہنے والے مسلمان کیا ہیں؟'' رائج فکر کے مطابق اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ''مسلمان ہندوستانی قوم کا ایک حصہ ہیں، البتہ ان کا ایک 'مذہب' ہے۔ 'مذہبی' معاملات میں وہ علاحدہ رہ سکتے ہیں، لیکن باقی معاملات میں ان کو وہی طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے، جو دوسرے ہندوستانی اختیار کرتے ہیں۔'' لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے اس سوال کا جواب دیں تو جواب یہ ہوگا:

''ہندوستان کے مسلمان عالمی امت مسلمہ کا ایک حصہ ہیں، جو ہندوستان میں رہتا ہے۔ یہاں کے دوسرے (غیر مسلم) عوام اور یہاں کی حکومت کے ساتھ مسلمانوں کو وہ معاملہ کرنا چاہیے، جو ان کے فرض منصبی کا تقاضا ہے۔''

ایک اور مثال لیجیے۔ یہ سوال پوچھا جاتا ہے کہ ''مسلمانوں کو اپنے دین پر ایمان رکھنے اور اس پر عمل کرنے کی آزادی کیوں حاصل رہنی چاہیے؟'' رائج فکر کے مطابق اس کا جواب یہ ہے کہ ''جس ملک میں مختلف مذاہب کے ماننے والے رہتے ہوں، وہاں امن و سلامتی کے لیے ضروری ہے کہ سب کو مذہبی آزادی حاصل ہو، ورنہ ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔'' اسلامی فکر کے مطابق اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے اور وہ اس کے لیے آزاد ہیں کہ اللہ ہی کی بندگی کریں۔ جو بھی طاقت اس آزادی کو سلب کرتی ہے وہ ظالم ہے، نیز اللہ ہی نے انسانوں کو یہ آزادی بھی دی ہے کہ اگر وہ اسلام کے علاوہ کوئی اور دین اختیار کرنا چاہیں تو ان کو اسلام لانے پر مجبور نہ کیا جائے۔''

یہ ایک حقیقت ہے کہ صالح کردار اور 'غلط فکر' جمع ہو سکتی ہیں، محض حسنِ نیت 'صالحیتِ فکر' کی ضمانت نہیں ہے۔ مسلمانوں کو شعوری طور پر اس کی کوشش کرنی ہوگی کہ ان کی فکر خالص اسلامی ہو اور جاہلیت کے تمام اثرات سے پاک ہو۔

ب) فکر کی صالحیت کے بعد دوسری ضرورت یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر باہمی گفتگو، تبادلۂ خیال اور بحث مباحثے کے لیے مناسب ذرائع موجود ہوں) اور اظہارِ رائے اور اظہارِ اختلاف کے اسلامی آداب کا شعور ان کے اندر عام ہو۔ اس وقت مسلمانوں کے اخبارات و رسائل مختلف مکاتبِ فکر کی رائیں تو پیش کرتے ہیں، لیکن باہم تبادلۂ خیال اور گفتگو کا موقع فراہم نہیں کرتے۔ اختلاف کے آداب کا شعور مفقود ہے۔ عام طور پر مسلمانوں کا خیال یہ ہے کہ کسی بات سے یا تو مکمل اختلاف کیا جا سکتا ہے یا کامل اتفاق۔ ایک دوسرے کے دلائل سے سیکھنے اور اپنے موقف کی اصلاح کرنے نیز بہ تدریج اتفاق رائے (Consensus) تک پہنچنے کا مزاج نہیں پایا جاتا۔ اس مزاج کی اصلاح ناگزیر ہے۔ اسلامی فکر کا حالات پر انطباق محض کسی فرد یا گروہ کا نام نہیں، بلکہ پوری امت کا کام ہے۔ اس کام کے لیے آپس میں صحت مند اور معیاری تبادلہ خیال (Communication) ضروری ہے۔ اس کے لیے مناسب ذرائع اور مناسب فضا پیدا کی جانی چاہیے۔

ج)مسلمانوں کو سیاست میں خود کفیل ہونا چاہیے۔اس کے معنٰی یہ ہیں کہ مسلمان یہ سمجھیں کہ اسلام انہیں موجودہ سیاسی پارٹیوں کے رکن یا خادم بننے) کی اجازت نہیں دیتا۔اس کے بر عکس اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ مسلمانوں کا امیر صرف ایک متقی مسلمان ہی ہو سکتا ہے، کسی اور کی امارت میں سیاسی ۔ جدوجہد جائز نہیں

اگر اسلام کی یہ تعلیم ہے تو مسلمانوں کو اپنے مسائل کے حل کے لیے اس کی اجازت نہیں ہو سکتی کہ وہ رائج الوقت پارٹیوں میں شامل ہو جائیں، بلکہ ان کو ۔ متقی قیادت کی سر کردگی میں شریعت کے حدود کے اندر سیاسی جدوجہد کرنی چاہیے اور اس کے لیے مناسب اجتماعی ہیئتیں تشکیل دینی چاہئیں

د)البتہ مسلمانوں کی خود اعتمادی کے معنٰی یہ نہیں ہیں کہ وہ غیر مسلموں سے کوئی واسطہ اور تعلق ہی نہ رکھیں۔ان کو غیر مسلموں سے ایجابی ربط رکھنا) : چاہیے۔عوام سے بھی، سیاسی پارٹیوں سے بھی اور اربابِ اقتدار سے بھی۔اس ربط کے تین اہم پہلو ہیں

اول یہ مسلمانوں کو تمام غیر مسلموں تک اسلام کی دعوت پہنچانی چاہیے۔یہ ربط کا بنیادی پہلو ہے۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ مسلمان 'شہادتِ حق' کی ذمہ داری پر مامور ہیں، یعنی ہر معاملے میں خلق خدا کے سامنے حق کو واضح کرنا ان کی ذمہ داری ہے۔ چناں چہ ان کو ہر سوال کے سلسلے میں پہلے یہ سمجھنا چاہیے کہ 'حق بہ جانب موقف' کیا ہے اور پھر اس کو بیان کرنا چاہیے۔

تیسرا پہلو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا ہے۔ مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ ہر معاملے میں معروف اور منکر کو واضح کریں، نیز معروف کی تلقین کریں اور منکر سے روکیں۔ یہ کام بھی 'الناس' یعنی غیر مسلموں اور مسلمانوں دونوں کے درمیان انجام دینے کا ہے۔

یہ آخری پہلو توجہ کا بہت زیادہ محتاج ہے۔اپنے مسائل کے حل کے لیے اربابِ اقتدار یا سیاسی پارٹیوں سے سودے بازی یا ان کے حضور فریاد وفغاں کی بجائے مسلمانوں کو کرنا یہ چاہیے کہ وہ 'منکر' سے روکیں۔ ظلم خواہ مسلمانوں پر ہو رہا ہو یا کسی اور پر، ایک منکر ہے اور بہت بڑا منکر ہے۔اس سے روکنا چاہیے۔یہی عمل مسلمانوں کے مسائل حل کرنے کا باعث بنے گا۔

ہ)خود اعتمادی کے معنی یہ بھی ہیں کہ مسلمان اپنے مسائل کے حل کے لیے خود تعمیری کوششیں کریں۔اپنے وسائل استعمال کریں اور اپنی اجتماعی طاقت صرف کریں۔یہ سارا کام اجتماعی انداز میں صالح قیادت کے تحت ہونا چاہیے۔ نیز جو مسائل محض تعمیری کوششوں سے حل نہ ہوں ان کے سلسلے میں ملک کے عوام، اہلِ صحافت، سیاسی پارٹیوں اور اہلِ اقتدار سے گفتگو کریں۔ لیکن یہ گفتگو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے رنگ میں ہونی چاہیے نہ کہ گداگری، فریاد وفغاں یا سودے بازی کے رنگ میں۔

مختصراً خود اعتمادی یہ ہے کہ مسلمانوں کی سیاست اسلامی ہو۔(محض مستقبل میں 'اسلامی ریاست' کو مقصود بنانا کافی نہیں ہے، بلکہ فی الحال اور اس وقت 'اسلامی سیاست' بھی درکار ہے)۔ مسلمانوں کی سیاست کو اسلامی بنائے بغیر ان کے معاشرے کو اسلامی معاشرہ نہیں بنایا جاسکتا۔

اگر مسلمانوں کی قیادت ان کاموں کو انجام دے، دوسرے لفظوں میں اسلامی فکر پیدا کرے، مسلمانوں کے درمیان باہم گفتگو اور تبادلہ خیال کے لیے سازگار اسلامی ماحول تعمیر کرے اور ان کی سیاست کو اسلام کے مطابق ڈھالے اور غیر اسلامی فکر سے مکمل اجتناب کرے اور غیر اسلامی سیاست سے پوری طرح الگ ہو جائے تو مسلمان موجودہ سیاسی رجحانات سے ممتاز ایک منفرد قوت بن سکتے ہیں، جو ان سب کے مقابلے میں مضبوط بھی ہو گی اور مؤثر بھی اور ملک وانسانیت کو اس سے فائدہ پہنچے گا۔خدا کرے کہ اقامت دین کے نام لیوا، مسلمانوں کو ایسی قیادت فراہم کر سکیں۔